مولانا محمد جعفر زیدیؒ کی خطابت

(از علامہ سید منتظر عباس نقوی مدظلہٗ)

فقہ اور ذاکری دو جداگانہ شعبے ہیں لیکن برصغیر کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہاں تقریباً ہر عہد میں ایسے نابغۂ روزگار افراد ہوتے رہے ہیں جو بیک وقت بلند مرتبہ فقیہ بھی رہے ہوں اور دنیائے خطابت میں بھی ان کے نام کا ڈنکا بجتا ہو، بلکہ سچ پوچھئے تو دنیائے شیعیت میں برصغیر وہ منفرد مقام ہے جہاں ذاکری پر فقہ کے نگران اثر نے خطابت کو تبلیغ، تدریس اور دفاعِ مذہب کا مضبوط ترین، مستقل محتاط اور ذمہ دار ادارہ بنا دیا ہے۔ وہ جامع صفات وکمالات شخصیات جن کے دم سے فقہ وذاکری کی دنیا آباد ہے، ان میں ایک نام ____ بلکہ بہت بڑا اور نمائندہ نام جناب سید محمد جعفر زیدی شہید کا ہے۔

نرم خوشگوار آواز، لہجے میں پُروقار، عالمانہ ٹھہراؤ، صاف ستھرے، اُلجھاؤ سے پاک، مختصر جملے جو خطیب کے واضح ذہن کے عکاس ہوں، انتہائی سادہ اور عام فہم زبان اور ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ مضبوط قرآنی منطق پر مبنی استدلال، گفتگو میں فکری تسلسل اور معلوم حقائق سے کام لے کر اپنے سامعین کو اَن دیکھی اور نظر انداز شدہ دنیاؤں کے حسن سے مسحور کر دینے والا بیان ____ یہ اور اس جیسی اجتماعی خوبیوں کی مالک شخصیت کا دوسرا نام محمد جعفر زیدی تھا۔

خطابت بہرطور لوگوں سے اجتماعی گفتگو ہوتی ہے اور صرف یک طرفہ گفتگو نہیں، جب تک سننے والے اس گفتگو سے تاثر نہ لیں، یہ گفتگو خطابت نہیں بنتی۔ لیکن اپنا اثر منتقل کرنے کیلئے خطیب سامع کی کونسی حس کو متوجہ کرتا ہے، یہ ہر مقرر کا اپنا انتخاب اور اپنا طریق کار ہے۔ ہمیں گزشتہ ایک صدی کے دوران، بعض افرادی رویوں سے قطع نظر، دو مکاتبِ فکر نمایاں نظر آتے ہیں:

پہلی نصف صدی میں جو خطابت منظرِ عام پر آئی، اسے ہم تدریسی خطابت کہہ سکتے ہیں۔ اس انداز کا بنیادی مقصد اپنے سامع کو باخبر کرنا، سمجھانا، سکھانا اور اس کو فکری سطح پر واضح اور مستحکم کرنا تھا۔

دوسری نصف صدی کا نمایاں رنگ، سکھانے، سمجھانے کی بجائے اپنے سامع کو مرعوب کرنا اور حیرت زدہ کرنا ہوگیا۔ سکھانے والا خطیب اپنے لب ولہجہ، اپنے افکار وخیالات کو زیادہ سے زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنی برتری قائم رکھتے ہوئے عوامی سطح پر اُتر کر اپنی بات دوسروں کے ذہنوں تک پہنچاتا ہے جبکہ مرعوب کرنے والے خطیب کا طریق کار مختلف ہوتا ہے۔ وہ عوامی سطح سے بہت بلند مقام پر بیٹھ کر وہاں سے آواز دیتا ہے: جس میں ہمت ہو، وہ اس بلندی تک آنے کی کوشش کرے۔ وہ کبھی اپنے حافظے سے، کبھی حسنِ بیان سے، کبھی ذہنی دوررسی اور نازک خیالی سے اور کبھی زبان ولغت پر اپنی گرفت سے اپنے سامع کو للکارتا ہے:

''کیا تم بھی یہ کمال دکھا سکتے ہو؟''

دونوں طریقوں کی اپنی اپنی افادیت اور اہمیت ہے۔ درس وتدریس کے انداز کی خطابت اپنے پورے مجمع میں علم کی تقسیم اس انداز سے کرتی ہے کہ تھوڑا تھوڑا

علم ہر ایک کے حصہ میں آجاتا ہے۔ اس کے برعکس مرعوب کن خطابت گنتی کے چند لوگوں کو علمی فیض پہنچاتی ہے۔ لیکن ان چند لوگوں کی سطح، مقابلتاً کافی بلند ہوتی ہے۔

قبلہ محمد جعفر زیدی درس وتدریس کے مکتبہ خطابت سے صرف تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس اندازِ خطابت کے نمائندہ فرد تھے۔ یہیں سے ہی ان کی خطابت کا پہلا حسین پہلو سامنے آتا ہے کہ ہر چند مقصودِ بیان کم علم مجمع کو بہت سی باتوں سے باخبر کرنا ہوتا تھا لیکن کیا مجال کہ کسی مرحلہ پر اُستادانہ رعونیت کا شائبہ بھی آجائے۔ وہ دھیمے دھیمے لہجہ میں، ''جہاں تک میں سمجھا ہوں''، ''جہاں تک میری نظر ہے''، قسم کے منکسرانہ جملوں کا سہارا لیتے ہوئے، مخاطب کی انا کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچائے بغیر، اس کے ذہن کو فکر ومعانی کے لاتعداد چراغوں سے منور کردیتے ہیں۔

ان کی تقریر کو اگر سامع کی نفسیات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کا اندازِ خطابت سب سے پہلے سامع سے ایک ہمدردانہ سماعت کی درخواست کرتا ہے۔ سامع جیسے ہی اپنی توجہ ان کی طرف مرکوز کرتا ہے تو دو تین جملے ایسے کہتے ہیں کہ سامع کا تجسس بیدار ہوجاتا ہے۔ بیان کی پہلی گرہ کھلتی ہے لیکن ساتھ ہی اشارہ ملتا ہے کہ ابھی ایک منزل اور ہے، ایک مرحلہ اس سے بھی اہم تر، اس سے آگے آنے والا ہے۔ دوسری منزل طے ہوتی ہے کہ مقرر کا ہاتھ ایک اور پردے کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہ تجسس اور انکشاف اور پھر ایک نیا تجسس اور ایک نیا انکشاف اس غیر محسوس انداز میں قدم بہ قدم آگے بڑھتا جاتا ہے کہ پھر سامع گردوپیش سے بے خبر ہوجاتا ہے اور انجامِ کار جب اور جہاں زیدی صاحب تقریر ختم فرماتے ہیں، سامع ایک جھرجھری لے کر بیدار ہوجاتا ہے اور اسے بے ساختہ احساس ہوتا ہے کہ وہ

بہت کچھ سیکھ گیا، بہت کچھ جان گیا۔

اب نہ زیدی صاحب کی فرمائش تھی، نہ انہوں نے اشارتاً اس خواہش کا اظہار کیا تھا، لیکن سامع ہے کہ ان کے احترام وعقیدت میں سراپا نیاز بنا ہوا اللہ تعالیٰ سے دعا کررہا ہوتا ہے کہ کاش! انہیں ایک مرتبہ پھر سننے کا موقعہ مل جائے۔

ماضی بعید کا خطیب اس اعتبار سے بدقسمت تھا کہ اس کی شاہکار خطابت بھی محض سامعین کے کمزور حافظوں کے تصرف میں تھی۔ لیکن آج کی خطابت ہر اعتبار سے محفوظ کی جاتی ہے اور کم وبیش تمام قابلِ ذکر ذاکرین کی تقاریر شائع بھی ہو چکی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خطابت ایک فن ہے، لیکن اگر اس فن کا اصل کام خیالات کو مؤثر انداز میں پیش کرنا ہے تو کئی ایسے مقررین جو دورانِ خطابت مجمع پر چھا جایا کرتے تھے، جب تحریری شکل میں سامنے آئے تو بہت مایوسی ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ صرف الفاظ، جملوں اور لہجے کی خطابت کرتے تھے، ورنہ اُن کے کلام میں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے ان کی عظمت کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاسکے۔

مولانا محمد جعفر زیدی کی تقاریر بھی شائع ہوئیں اور ان کے متعدد مضامین اور مقالے بھی۔ چنانچہ تقریر اور تحریر کے ان نمونوں کا مقابلہ کیجئے تو پہلے تو اس بات پر خوشگوار حیرت ہوگی کہ ان کی تحریر اور تقریر میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ وہ تقریر کے دوران بھی اپنے افکار اور اُن کی ادائیگی پر یکساں گرفت رکھتے تھے۔ وہی منطقی استدلال، مطالعہ قرآن میں وہی باریک بینی، وہی خوب سے خوب تر کی جستجو اور زینہ بہ زینہ، قدم بہ قدم بڑھتے ہوئے غیر محسوس طور پر مقصودِ بیان تک پہنچ جانے کا وہی

طریقہ کار۔ اس طرح ان کی تحریر ہو یا تقریر، دونوں یکساں طور پر وزن دار ہیں۔

چنانچہ ان کی تقریر کے مجموعے باقاعدہ کتاب کی سی منزلت اور شرف رکھتے ہیں۔ اس مطالعہ کا دوسرا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ زیدی صاحب بہت سے خوش بیان مقررین کے برعکس، جملوں پر بہت کم توجہ دیتے تھے۔ وہ جملوں کے مقرر نہیں تھے، وہ افکار اور نظریات پیش کرتے تھے اور فکر پیش کرنے والا کبھی جملوں کو اتنا آراستہ نہیں کرتا کہ وہ خیال کے حسن پر غالب آجائیں۔

اس کے باوجود یہ تو ان کے شاعرانہ اور ادبی مزاج کی فطری مجبوری تھی کہ بارہا خوبصورت ادبی جملے بے ساختہ طور پر زبان پر آجاتے اور جب بھی ایسا کوئی جملہ زبان سے ادا ہوتا تو حسنِ بیان اپنی طرف متوجہ کرنے کی بجائے زیرِ بحث خیال کو اور نمایاں کردیتا۔ ان کے بیان میں خوبصورت جملے ہمیشہ پس منظر کے طور پر آتے، منظر وہی رہتا جو وہ دکھا رہے ہوتے۔

شافعی کے ایک شعر کا ترجمہ کرتے ہوئے فرمانے لگے:

''جو جنت میں لے جائیں، اُن کی محبت گناہ ہو تو کیا جہنم میں لے جانے والوں سے محبت کروں؟ جو جہنم میں لے جائیں، ان سے محبت کیوں کروں؟ جائیں جہنم میں ____''

سورۂ نور کی پینتیسویں (۳۵) آیت کا یہ جزو زیرِ بحث تھا کہ اللہ کے نور کی مثال ایک ایسے چراغ کی ہے جس کا روغن اُسے روشن رکھتا ہے، حالانکہ آگ نے اسے چھوا تک نہیں، تو کہنے لگے:

''چراغ آگ سے بھی روشن ہوتے ہیں، روشن بھی ہوتے ہیں مگر جلتے بھی

ہیں اور جو جلتے ہیں، وہ جلاتے بھی ہیں۔ خداوند عالم نے اس چراغ کو چراغِ رحمت قرار دیا___ بچائے گا وہی جو خود بچا ہوگا۔ نار سے روشن ہونے والے چراغ نام کے روشن ہوتے ہیں، مگر سوزش ہوتی ہے، جلتے بھی ہیں اور جلاتے بھی ہیں___ یہی وجہ تھی کہ نار کی ایک مخلوق تھی بلندیٔ فلک پر___ تو جو نار سے پیدا ہوا تھا، وہ جل اُٹھا۔ سجدہ کرنے والے سجدہ کررہے تھے، نہ کرنے والا سرکش بنا ہوا تھا۔ آدم مسجود بھی ہو رہے تھے اور محسود بھی ہو رہے تھے''۔

آنحضورؐ کی معروف حدیث پر بات کررہے تھے کہ ''علیؑ کے چہرے پر نظر ڈالنا عبادت ہے''، فرماتے ہیں:

''نظر روئے علیؑ پر بھی عبادت ہے، نظر کعبہ پر عبادت ہے، نظر حروفِ قرآن پر عبادت ہے۔ لیکن یہ نظر جو اِن چیزوں پر ہو تو کیا ہر نظر عبادت ہے؟ ہر ایک نظر ایک نہیں ہوتی، نظر تو ایسی بھی ہوتی ہے کہ جس سے بچایا بھی جاتا ہے___''۔

ہشام بن حکم اصحابِ امام جعفر صادق علیہ السلام میں سے تھے، ایک دن بصرہ کے ایک شیخ سے اپنے مناظرے کا ذکر کرنے لگے، زیدی صاحب نقل روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں نے سنا ہے کہ بصرہ میں بڑا زبردست علامہ آیا ہوا ہے اور وہاں کی جامعہ مسجد میں وہ بڑے مغلق اور اُلجھے ہوئے مسائل حل کرتا جاتا ہے۔ فرزندِ رسولؐ! مجھے بھی اشتیاق ہوا کہ میں بھی تو اس شیخ کو دیکھوں، اس کی شیخی کو دیکھوں___''۔

مولانا محمد جعفر زیدی کی خطابت اور تحریر کا سب سے بڑا فیض یہ نہیں کہ اُنہوں نے بے مثال تفسیری نکتے بیان کیے، ذہنی گتھیوں کو سلجھایا، یا اپنے مؤقف کی

تائید وحمایت میں ٹھوس اور مضبوط دلائل فراہم کیے۔ یہ سب تو بیشتر صاحبانِ علم اور صاحبانِ کمال کرتے ہی رہتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کا فیضانِ خاص یہ ہے کہ ان کی خطابت ظاہری طور پر کسی ایک آیت کی تشریح اور کسی ایک مسئلہ کی وضاحت ہوتی، لیکن درحقیقت وہ انتہائی غیر محسوس انداز میں اپنے سامع (اور اب اپنے قاری) کے ذہن میں عظمتِ قرآن کا ایسا نقش اُبھارتے جاتے ہیں کہ اختتامِ کلام تک پہنچتے پہنچتے اسے قرآنِ حکیم کے معجزہ ہونے، اس کے ہر لفظ، ہر حرف اور ہر حرکت کے بامقصد اور بامعنی ہونے کا ایک نیا یقین حاصل ہوجاتا ہے۔ اگر توفیق الٰہی شامل حال ہو اور وہ طلبِ علم قرآن پر آمادہ ہو تو اس میں قرآن فہمی کا ایک ایسا مزاج پیدا ہوجاتا ہے جو کبھی لفظی معنی کی سطح پر نہیں رُکتا بلکہ مفاہیم کے بحرِ ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کرتا ہے اور انجامِ کار اُسے علم و آگہی کی نئی دنیاؤں تک رسائی حاصل ہوجاتی ہے۔

یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی زیادہ تفاسیر اور خصوصاً اُردو زبان میں تمام مسالک کے علماء کی تالیف کردہ کم و بیش تمام تفاسیر، پورے قرآنِ حکیم کی تفسیر ہونے کی بجائے اس کے منتخب مقامات کے وضاحتی حواشی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یعنی اکثر اوقات مفسر کسی ایک آیت کے محض ایک لفظ کی یا زیادہ سے زیادہ اس آیت کے مجموعی مفہوم کی تشریح کو کافی سمجھتا ہے۔ اس کے بعد آیت کے باقی اجزاء کو اور بعض اوقات اس کے بعد کی تین تین، چار چار آیات کو محض ترجمہ کرکے آگے بڑھ جاتا ہے۔

مفسر کے اس طرزِ عمل کی وجوہات سے قطع نظر، اس کا ایک منفی نتیجہ یہ ہے کہ تفسیر کا قاری نفسیاتی طور پر سمجھنے لگتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے توجہ اور غور و فکر کے تمام تر

مقامات وہی تھے جن کی طرف مفسر نے اشارہ کیا ہے۔ باقی الفاظِ قرآن مجید توجہ کے طلبگار نہیں ہیں۔ اس طرح پڑھے لکھوں کی عوامی سطح پر آیاتِ قرآنی کے مفہوم سے سرسری گزر جانے کا خطرناک رجحان پیدا ہو گیا۔ ان کو تو ایک طرف رکھئے جو اس کتاب کی تلاوت ہی پر اکتفا کرتے ہیں، وہ لوگ جو تلاوت سے آگے بڑھ کر اللہ کے کلام کو سمجھنے کی کاوش کر رہے ہوتے ہیں، وہ بھی مفسرین کی حاشیہ نویسی کی وجہ سے مفاہیم قرآن کا یک رُخا، جزوی اور محدود مشاہدہ کرتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے تفصیلی اور تفسیری مطالعہ کیلئے اوّلاً زبان کے قواعد اور لغت پر بھرپور دسترس کے ساتھ ساتھ، جزئیات پر توجہ دینے اور ہر قدم پر رُک کر غور و فکر کرنے کا مزاج اور اس مزاج کے تقاضے پورے کرنے کیلئے مطلوبہ بے پناہ محنت کا جذبہ درکار ہے۔ ان تمام بنیادی شرائط کی موجودگی کے باوجود حاصل شدہ حقائق کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے کسی نتیجہ تک پہنچنے کیلئے جس ذہن رسا اور عقلِ سلیم کی ضرورت ہوتی ہے، اگر اسی کی مدد حاصل نہ ہو تو یہ ساری تگ و دو طالب علم کو تھکا دیتی ہے لیکن اس کے سامنے معنی و مفہوم کا کوئی ایسا منظر نہیں بن پاتا کہ وہ اپنی سعی کو مشکور سمجھے اور حصول و دریافت کے احساس سے سرشار ہو کر ''ھل من مزید'' کا نعرہ لگاتے ہوئے دریائے معنی کی غواصی میں مشغول ہو جائے۔

زیدی صاحب کا بنیادی موضوع تفسیر قرآن ہے۔ وہ جس آیت کو عنوان بناتے ہیں، اُس کی شرح اور وضاحت اس قدر باریک بینی سے کرتے ہیں کہ گفتگو کے اختتام پر سامع اپنا وزن بڑھا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اسے روز کی سنی ہوئی آیت ایک نئے انداز سے دکھائی دینے لگتی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ اب تک وہ کچھ نہیں

جانتا تھا۔

یہ سب تو ہوتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر، بالکل غیر محسوس انداز میں ان کا قاری قرآن مجید کو دیکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کا ایک نیا انداز سیکھ جاتا ہے۔ اگر وہ قرآن کے مفہوم پر توجہ دینے کا عادی رہا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اب تک وہ کچھ نہیں جانتا تھا بلکہ وہ تو انتہائی بدقسمت تھا کہ قسمت نے اسے ایک عظیم الشان خزانے تک پہنچا دیا تھا، پھر بھی وہ فقط ایک آدھ موتی کو کل خزانہ سمجھ کر، انہیں ہی مٹھی میں دبا لایا تھا۔

زیدی صاحب کا یہ ہمیشہ کا معمول تھا کہ وہ کسی آیتِ قرآنی کو سرنامہ تقریر قرار دیں، یا دورانِ کلام کوئی آیت یا اس کا جزو بطورِ حوالہ زبان پر آ جائے، وہ الفاظِ قرآن کا تفصیلی تجزیہ کرتے تھے۔ ان کے اندازِ بیان کو ملاحظہ فرمائیں، وہ آیات کا تجزیہ کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ پہلے تو اس کا ترجمہ کرتے ہیں، پھر ایک ایک لفظ کی تحلیل کرتے ہیں، لغت اور قواعد کے اعتبار سے اس کا جائزہ لے کر معنی میں جو تغیرات ہوتے ہیں، اُن کو زیر بحث لاتے ہیں، اس کے ساتھ یہ بھی بتاتے جاتے ہیں کہ اس کے مترادف اور ہم معنی الفاظ کون سے ہیں اور ان کے استعمال کرنے سے مفہوم کیا ہو جاتا ہے۔

یہ ساری گفتگو اس سلیقہ اور حسن سے ہوتی ہے کہ سننے والا ایک پُر تجسس انہماک میں کھو جاتا ہے۔ زیدی صاحب اُسے قدم بہ قدم آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔ لیکن ہر قدم پر رُک کر اُسے سوچنے، غور کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے نگاہوں کے سامنے سے پردے اُٹھتے جاتے ہیں۔ ہر لمحہ منظر بدلتا جاتا ہے، نئی نئی

کیفیت چونکاتی جاتی ہے، حتیٰ کہ آخری حجاب اُٹھتا ہے اور پھر سامع انکشاف و دریافت کے اس خوش کن منظر سے آشنا ہوتا ہے کہ بے ساختہ زبان پر ''سبحان اللہ'' کا نعرہ آجاتا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک بالکل غیر محسوس انداز میں اسے قرآن مجید کی گہرائی اور معنوی وسعتوں کا یقین کامل سے کامل تر ہوتا جاتا ہے اور یہ یقین کئی جہتوں میں سفر کرتا ہے۔ کبھی اُسے احساس ہوتا ہے کہ اللہ کا کلام کتنا معنی خیز ہے، اس کا کوئی حرف، کوئی لفظ، نہ تو بے مقصد ہے، نہ بے محل ہے۔ کیا کوئی بشر اس جامعیت کے ساتھ، اس مقصدیت کے ساتھ، اس حسن کے ساتھ، اتنی طویل گفتگو کرسکتا ہے؟ نہیں! یہ بشر کی طاقت سے بالاتر ہے۔ یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام نہیں ہوسکتا۔ کبھی اسے علم قرآن کے سامنے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور قرآن فہمی کیلئے ایک شدید تڑپ، ایک اشتیاق بیدار ہوجاتا ہے۔

میں نے زیدی صاحب کے اندازِ بیان کے متعلق جو کچھ عرض کیا ہے، ان کا ہر بیان اور ہر تحریر میرے مشاہدے کی صداقت کی گواہ ہے۔ ان کا کوئی بیان لے لیجئے، آپ تفسیر کا یہی انداز پائیں گے۔ یہاں صرف ایک تقریر کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

مولانا کی تقاریر کا پہلا مجموعہ، ان کی شہادت کے بعد، اہلیہ شاہد ذوالفقار نے، مجموعۂ تقاریر کے نام سے کراچی سے شائع کروایا تھا، اس مجموعہ میں پانچویں تقریر تقریباً دو گھنٹے کے دورانیہ کی ہے، اس تقریر میں ان کا موضوع سورۂ احزاب کی تئیسویں (۲۳) اور چوبیسویں (۲۴) آیت ہے۔

مولانا صاحب نے حسبِ عادت پہلے تو آیات کو اجزاء میں منقسم کرکے اس

کا ترجمہ کیا:

''ایمان والوں میں سے ہیں کچھ مرد، کچھ مردانِ ملت مردانِ وفا، جو سچ کر دکھاتے ہیں اس معاہدے کو جو وہ خدا سے کئے ہوئے ہیں، کوئی اپنے عہد کو پورا کرچکا ہے اور کوئی اپنے عہد کو پورا کرنے کے انتظار میں ہے۔ نظر ہے اس کی اس پر کہ کب وقت آئے اور کب وہ اپنا عہد پورا کرے''۔

دوبارہ پھر اسی داستان کو مختصر الفاظ میں دہرایا جاتا ہے کہ یہ ہیں ایسے عہد کے پورا کرنے والے کہ انہوں نے اپنے عہد میں اور وفائے عہد میں ذرّہ کے برابر تبدیلی نہیں کی۔ جس شان سے عہد کیا، اُسی شان سے اپنے عہد کو پورا کردکھایا۔ اللہ ان صادقین کو ان کی صداقت کی بہترین جزا دے گا اور ضرور منافقین پر عذاب نازل کرے گا۔ ہاں! ہمارے عذاب سے بچ جائے گا وہ جو اس گروہ سے توبہ کرتا ہوا نکل آئے گا۔

اس فصیح اور ذمہ دارانہ ترجمے کے بعد مولانا نے ایک دعویٰ کیا، دیکھنے میں ایک قول ہے یہ آیت مگر حقیقتاً یہ وہ آیت ہے جو دنیا سے منوا رہی ہے کہ یہ کلام غیر خدا کا کلام نہیں ہے۔ یہ خود خدا کا کلام ہے۔ اس کے بعد جب انہوں نے آیات کی تفسیر کی تو پھر یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی کہ ''پس ثابت ہوا کہ یہ اللہ کا کلام ہے''۔ یہ بات تو کلام کا ہر لفظ جہاں جہاں تھا، وہاں سے پکار کر کہہ رہا تھا۔

مولانا نے پہلی بحث آیت کے پہلے لفظ پر کی کہ یہاں ''الذین آمنوا'' نہیں کہا گیا، ''من المؤمنین'' کہا گیا ہے۔ یعنی موضوعِ گفتگو وہ نہیں جو ایمان لانے کے مدعی ہیں بلکہ ان کی بات ہے جن کو مؤمن کہہ کر اللہ خود ان کے ایمان کی

تصدیق کررہا ہے۔ پھر ایک دلکش گفتگو ہے اس فرق پر کہ مؤمن کی طرف سے دعوائے ایمان میں اور اللہ کی طرف سے سندِ ایمان میں کیا فرق ہے؟

اس کے بعد لفظ رجل (مرد) پر بحث شروع ہوئی کہ یہ لفظ اگر خواتین کے مقابل بولا جاتا تو کیا معنی ہوتے اور جب مردوں کے مجمع میں کسی کو مرد کہا جائے تو یہ لفظ کیا معنی دے گا!

اس تشریح سے آگے بڑھے تو یہ سوال ہوا کہ اللہ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ان مؤمنین نے اپنا عہد پورا کیا بلکہ ارشاد ہوا ہے کہ اُنہوں نے معاہدہ پورا کیا۔ اب عہد اور معاہدہ میں فرق یہ ہے کہ عہد صرف ایک فریق کرتا ہے جبکہ معاہدہ فریقین کے ایک دوسرے سے عہد کرنے کو کہتے ہیں۔

یہاں سے گفتگو ایک اور طرف مڑی اور سوال پیدا ہوا کہ مؤمن نے تو عہدِ اطاعت کیا تھا، معاہدے میں عہدِ الٰہی کیا تھا؟ اس سوال کا جواب انہیں سورۂ بقرہ کی آیت 124 میں ''لا ینال عھدی الظالمین'' میں ملا۔

پھر یہ نہیں کہ وہ تبدیل نہیں ہوئے بلکہ ''وما بدلوا تبدیلا'' کہہ کر فعل مطلق استعمال ہوا اور اگر فعل مطلق اثباتی طور پر استعمال ہو (جیسے یطھرکم تطھیرا میں) تو اس سے معنی کیا بنتے ہیں اور اگر نفی کی صورت ہو (جیسے زیر بحث آیت میں ہے) تو کیا مطلب ہوں گے؟

اس کے بعد اس بات پر غور وفکر شروع ہوا کہ اجر دیتے ہوئے یہ نہیں کہا گیا کہ ان کے ایفائے عہد پر اجر دیا جارہا ہے بلکہ ارشاد ہوا کہ ان صادقین کی صداقت کا اجر ہے۔ ایفائے عہد کی بجائے یہ کہنا کہ انہوں نے اپنے قول کو سچ کر دکھایا، یہ اندازِ

بیان تکمیل عہد کے عمل کی عظمت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

جزاء کا ذکر کرتے ہوئے ''لیجزی'' میں حرفِ 'ل' آیا ہے، اس 'ل' نے جزاء کو ان کا واجب حق قرار دے دیا۔

پھر اس پر بحث کہ مؤمنین کے وعدہ کو سچا کر دکھانے کے تذکرہ میں منافقین پر عذاب کا ذکر کیا اہمیت رکھتا ہے اور پھر مؤمن کے مقابل شرک آتا، کافر آتا، منافق ہی کیوں؟

اس کے بعد توبہ کرنے والوں کو عذاب سے مستثنیٰ قرار دیا جانا اور ان توبہ کرنے والوں کا صیغہ جمع میں بیان ہونا ___

غرض زیدی صاحب آیاتِ قرآنی کے ہر جزو پر ٹھہر کر، ذہنوں کو مہمیز کرتے ہوئے، جب ایک ایک لفظ اور حرف کی معنویت اور مقصدیت پر بحث کرتے ہیں تو قرآن مجید کی عظمت ہر سامع کا ذاتی مشاہدہ بن جاتی ہے اور اس کے کلامِ الٰہی ہونے کا عقیدہ محض ایک تقلیدی عقیدہ نہیں رہتا بلکہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ ایک عظیم الشان کتاب کے ہر لفظ میں معنی ومفہوم کا بحرِ بیکراں کسی قابل سے قابل انسان کے بس کی بات نہیں اور قرآن یقیناً کلامِ الٰہی ہے۔

مناسب ہوگا کہ زیدی صاحب کی تقاریر کے اس مجموعے کے مطالعہ سے پہلے آپ ان کے کچھ اور فکری شاہ پاروں کا نمونہ ملاحظہ فرمالیں۔ البتہ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ جیسے پہلے کہا جاچکا ہے کہ زیدی صاحب جملوں کے خطیب نہیں، افکار ونظریات کے مقرر ہیں۔ ظاہر ہے کہ فکر ہو یا آیاتِ قرآنی کی تاویل، ان سب کا حقیقی حسن اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب بیان اپنے پورے پس منظر

کے ساتھ سامنے آئے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں، اس لئے اختصار کے ساتھ صرف کچھ مقامات ہی نقل کئے جاسکیں گے۔

امام حسینؑ کا بیعتِ یزید سے انکار

''حق اپنے منوانے کیلئے کبھی تشدد نہیں کرتا مگر باطل اگر تشدد سے کام نہ لے تو وہ مانا کیسے جائے؟ اور نہ مانا جائے تو رہے کیا؟ یہی وجہ ہے کہ خدا اور رسولؐ اور اولی الامر اپنے منوانے کیلئے کبھی نبرد آزما نہیں ہوئے۔ خدائی کا دعویٰ ہو یا نبوت و امامت کا، اگر محض دعویٰ کی حد میں رہے تو ان میں سے کسی کو حرب وقتال کی ضرورت نہیں۔ اپنی جگہ جس کا جو دل چاہے، کہتا رہے۔ یہ سب برداشت کیا جاسکتا ہے اور برداشت کیا گیا ہے۔ لیکن اگر خدائی کا مدعی چاہے کہ خود خدا بھی اس کو خدا مان لے، رسالت کا مدعی اگر چاہے کہ رسولؐ برحق بھی اپنی رسالت کو خیرباد کہہ کر اس کو رسول مان لیں، ولایت اور امامت کے مدعی اگر یہ چاہیں کہ اولی الامر بھی ان کو اولی الامر تسلیم کرلیں تو یہ ہرایک کیلئے ناقابل برداشت، ناممکن اور محال ہے۔

اگر خدا نے غیر خدا کو خدا مان لیا تو یہ بات تو بعد کی ہے کہ وہ مانا ہوا حقیقتاً خدا ہوگیا یا نہ ہوا، لیکن خدا تو خدا نہ رہا۔ رسول نے اگر غیر رسول کو رسول مان لیا تو رسول، رسول نہ رہا۔ اب رسول کے رسول نہ رہنے سے اور ولی الامر کے ولی الامر نہ رہنے سے صرف ان ہی کے منصب کو زوال نہ ہوگا بلکہ جس خدا نے ان کو اپنے کمالِ علم اور انتہائے اعتماد سے منتخب کیا تھا، وہ جاہل اور بے بس ثابت ہوا''۔

اہلبیت اور نااہلیت کی انتہائیں

''مجھے ایک نبی وہ نظر آتا ہے جس نے خدا سے اپنے فرزند کے بارے میں

کہا اور جواب ملا کہ ہمارے نبی ایک بار تو کہہ چکے، اب اگر کہو گے تو ڈوبنے والا تو نہ بچے گا لیکن تمہارا نام فہرستِ انبیاء سے نکال دیا جائے گا۔ اب اگر تم نے کہا تو نبی نہ رہو گے ___ ایک وہ مقام ہے کہ جہاں نبی کہے تو نبی نہ رہے، ذہن میں رکھئے گا اسے، اور ایک مقام وہ ہے کہ اگر نبی نہ کہے تو نبی نہ رہے:

''وَاِن لَّم تَفعَل فَمَابَلَّغتَ رِسَالَۃَ''

''رسولؐ! اگر تم نے یہ نہ پہنچایا تو کچھ بھی نہ پہنچایا''۔

''کچھ بھی نہ پہنچایا'' کے معنی پھر یہی نکلے کہ نہ کہا تو رسول نہ رہے۔ وہاں اگر نبی کہے تو نبی نہ رہے اور یہاں اگر نبی نہ کہے تو نبی نہ رہے۔

سبع مثانی کی تاویل

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: (الحجر: 87)

''وَلَقَد آتَینٰکَ سَبعَامِنَ المَثَانِی وَالقُرآنَ العَظِیم''۔

''اے انسان! دے دیئے ہم نے تجھے سرمایۂ ہدایت قرار دے کر ایک سبعامن المثانی اور پھر وہ قرآن جو باعظمت ہے''۔

تو حضراتِ والا! مفسرین نے اگرچہ بڑی بڑی بحثیں قائم کی ہیں مگر قرآن مجید کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس سے پہلے جس شے (سبعامن المثانی) کا ذکر ہے، وہ قرآن العظیم سے وابستہ تو ضرور ہے مگر ہے اس کے علاوہ کوئی اور چیز۔

سبعامن المثانی میں سبع کے معنی سات ہیں۔ سات کو جب مکرر کیجئے تو چودہ خود بخود آپ کے سامنے آئیں گے۔ تو آپ محسوس فرمالیں گے کہ یہاں چودہ معصومینؑ کا ذکر ہے اور وہ سات وہ ہیں جو مکررات میں سے ہیں۔

اب یہ بحث واقعتاً بڑی دلچسپ ہوگی کہ چودہ کے ذکر کیلئے چودہ ہی کیوں نہ کہا، چودہ ہی کا عدد کیوں نہ پیش کردیا؟ تو حضرات! ایک عجیب راز ہے اس میں کہ اگر چودہ کا عدد کھلم کھلا استعمال ہوجاتا تو کوئی اس چودہ کو بتاتا اور کوئی اُس چودہ کو۔ خداوند عالم نے چودہ کا تعارف اس حیثیت سے کروایا کہ سوائے اصل مؤقف کے دوسری جگہ کوئی جا ہی نہ سکے۔

سات کہا اور پھر سبعامن المثانی کہہ کر یہ بتادیا کہ مراد یہاں چودہ ہیں، جو خود چودہ ہیں۔ مگر ان کے نام چودہ نہیں۔ گنتے جایئے تو چودہ ضرور کہیئے گا۔ لیکن اگر ناموں کو گنیں گے تو وہ سات ہی نظر آئیں گے۔ انہی میں سے گھوم پھر کر چودہ کی گنتی پوری ہوجاتی ہے، مثلاً اگر پنجتنؑ پاک ہیں، وہ جس طرح خود پانچ ہیں، اسی طرح ان کے نام بھی پانچ ہیں، ان کے درمیان کوئی نام مکرر نہیں آیا۔ ان کے بعد جو نو ہیں، ان کے ناموں پر نظر کی جائے تو جو نام بالکل نئے آئے ہوئے ہیں اور پہلے سے نہ آئے ہوں، وہ صرف دو ہیں: جعفرؑ اور موسیٰؑ

یہاں مراد یہ ہے کہ وہ چودہ حضرات دیکھو جن کے نام سات سے آگے نہ بڑھیں"۔